باب 5

وکالت اور عملی زندگی

وکالت کی ابتدا

میں نے سرینگر آ کر سب سے پہلے تو لائسنس کے لیے ہائی کورٹ میں درخواست دی۔ اس زمانے میں پورے انڈیا میں ہی ایسا ہوتا تھا کہ پہلے دو سال کے لیے پلیڈرشپ کا لائسنس دیا جاتا تھا جس کے تحت ہائی کورٹ اور فنانشل کمشنر سے زیریں عدالتوں میں وکالت کی جاسکتی تھی۔ اس کے بعد دو سال کے لیے وکالت کا لائسنس جاری ہوتا تھا جس کے تحت ہائی کورٹ اور فنانشل کمشنر کے پاس صرف ان اپیل کیسز میں پیش ہو سکتے تھے جن کی ماتحت عدالتوں میں خود پیروی کی۔ اس کے دو سال بعد ہائی کورٹ میں براہ راست پیش ہونے کے لیے ایڈووکیٹ کا لائسنس جاری ہوتا تھا۔ جنک سنگھ نامی ایک سکھ جو کہ لائسنس کلرک تھا، نے مجھ سے کاغذات لے لیے اور تین دنوں کے بعد مجھے لائسنس تھما دیا۔

میں پہلے تو کچھ عرصہ دہلی میں ایک نامور وکیل پالکی والا کے چیمبر میں حاضری دیتا رہا لیکن وہاں اپنے آپ کو انتہائی اکتاہٹ کا شکار پایا۔ پھر بارہ مولہ میں سید مبارک شاہ کے چیمبرز میں آمدورفت جاری رکھی۔ کچھ عرصے کے بعد سید مبارک شاہ نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ابتدائی عدالت میں کچھ مدت کے لیے رہ کر پھر ضلعی اور اس کے بعد ریاستی صدر مقام پر آ جاؤں۔ چنانچہ میں اپنے آبائی

علاقہ کرناہ جس کو انتظامی طور پر ٹنگڈار کہا جاتا تھا، شفٹ ہو گیا۔ یہاں چوں کہ میرا خاندانی طور پر پہلے سے ہی اثر ورسوخ تھا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے نمایاں بھی تھا، اس لیے فوری طور پر سب لوگوں نے میری پذیرائی کی۔ مجھ سے ایک سال پہلے یہاں عبدالرشید مرچال علی گڑھ سے ہی لاء کی ڈگری لے کر آئے تھے اور یہیں وکالت شروع کی تھی۔ ان کے علاوہ بارہ مولہ لڈی ڈورہ سے تعلق رکھنے والے راجہ خورشید احمد خان مرحوم نے بھی یہیں وکالت شروع کی تھی۔ یہ دونوں لوگ علی گڑھ میں مجھ سے ایک سال سینئر تھے۔ خورشید صاحب کے ساتھ میری رفاقت اور بے تکلفی بھی تھی۔ ان کو میں نے ایل ایل بی کے دوسرے سال کے امتحان میں زبردستی اپنے کمرے میں رکھا تھا کیوں کہ کسی پریشانی کی وجہ سے یہ امتحان نہیں دینا چاہتے تھے۔ میں نے ان کو بہلا کر اپنے ساتھ رکھ کر تیاری کروائی اور پھر وہ اچھی پوزیشن میں پاس بھی ہو گئے اس لیے میرے بڑے ممنون تھے جبکہ رشید مرچال صاحب میرے سسرالیوں کے قریبی رشتہ دار اور کرناہ کے ایک مشہور ذیلدار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ خود بھی بہت ہی سلیقہ مند، محنتی اور ذہین آدمی تھے۔

خورشید صاحب وہاں سے نکل کر منصف مقرر ہو گئے جو مقبوضہ کشمیر بلکہ پورے ہندوستان میں جوڈیشل سروس میں ابتدائی کیریئر ہے جس کے بعد وہ سب جج، سینئر سب جج، چیف جوڈیشل مجسٹریٹ، ایڈیشنل سیشن جج اور پھر سیشن جج کا کیڈر حاصل کرنے کے چار سال بعد فوت ہو گئے۔ موصوف انتہائی نیک نام، دیانتدار اور نڈر جج کے طور پر جانے پہچانے جاتے تھے۔ میرے پاس پاکستان دو تین مرتبہ آئے بھی تھے۔ زندگی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی اور وہ پچاس برس کی عمر میں ہی اس دنیا سے چل بسے۔ اللہ ان کو جنت نصیب کرے، آمین۔ رشید مرچال صاحب بھی وہاں سے منتقل ہو کر ضلعی صدر مقام بارہ مولہ اور نیا ضلع بننے کے بعد کپواڑہ آ گئے کیوں کہ ہمارا علاقہ اس میں شامل ہے۔

پہلا مقدمہ

ٹنگڈار / کرناہ میں ان دنوں منصف کے اختیارات تحصیلدار کے پاس ہوا کرتے تھے جو

اس حیثیت میں فوجداری اور دیوانی مقدمات کی سماعت کرتا تھا وہاں ایک خوبرو نوجوان ہندو تحصیلدار تھا۔ میرے ماموں اس تحصیل میں ملازم تھے اور ان کو منصب کی ذمہ داریوں کے حوالہ سے واصل باقی صاحب کے نام سے جانا جاتا تھا۔ تحصیلدار کو میرا تعارف پہلے سے تھا کیوں کہ وہ میرے علی گڑھ میں تعلیم کے دوران کئی بار گھر میری موجودگی میں آ چکے تھے۔

آزادانہ طور پر مجھے پہلی بار عدالت میں پیش ہونے کا موقع اس وقت ملا جب اس عدالت میں کیرن سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں کی جانب سے 107/151 ضابطہ فوجداری دفعات میں ماخوذ مسئولان کی جانب سے وکالت نامہ پیش کیا۔ یہ ایک ہی گھر کے چھ افراد تھے' میں نے ان کو مستثنیٰ کرنے کی درخواست پیش کی۔ جس کی دو وجوہات درج تھیں، ایک یہ کہ یہ لوگ علاقہ کیرن سے تعلق رکھتے ہیں اور دو بلند ترین برف پوش گلیاں عبور کر کے عدالت میں حاضر ہوتے ہیں، ان سب کا تعلق ایک ہی گھر سے ہے جن کو عداوت کی بنا پر ماخوذ کیا گیا ہے۔ تحصیلدار نے درخواست پڑھی اور پوچھا کہ کیا درخواست آپ نے خود لکھی ہے؟ میں نے کہا کہ میرے کہنے پر اختر علی خان عرائض نویس نے لکھی ہے وہ بہت خوش ہوا اور کہا کہ ان لوگوں کو مستثنیٰ کرنے کے لیے آپ نے بڑی معقول وجوہات لکھی ہیں۔ لیکن جس دفعہ کے تحت درخواست دی گئی ہے اس کا اطلاق اس کیس میں نہیں ہوتا میں نے اس سے کہا کہ اگر آپ کو اختیار حاصل ہے تو جس دفعہ کا اطلاق ہوتا ہے اس کے تحت حکم کر دیں، وہ ہنس کر بولا کہ میں کیس کل تک ملتوی کرتا ہوں۔ آپ قانون کی متعلقہ دفعہ کے تحت بحث کریں میں نے اس سے دفعہ پوچھی تو اس نے کہا کہ یہی آپ کا امتحان ہے۔ عدالت میں موجود رشید مرچال صاحب اور خورشید خان صاحب سے کہا کہ اگر آپ کو علم ہے تو بھی آپ گیلانی صاحب کو نہیں بتائیں گے ان کو خود تیاری کرنے دیں۔ مجھے اس بات پر بہت غصہ آیا کیوں کہ میں نے پانچ آدمیوں کو مستثنیٰ کرانے کے لیے 25 روپے فیس لی تھی اور اسی روز حکم حاصل کرنے کا یقین دلایا تھا لیکن غصے کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ ساتھ ہی مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اس شخص نے مجھ پر مہربانی بھی کی ہے کہ درخواست خارج نہیں کی بلکہ مجھے تیاری کا موقع بھی دیا ہے۔

میں چوں کہ فریش گریجویٹ تھا اور یونیورسٹی میں پڑھا ہوا ضابطہ فوجداری طالب علم کی حیثیت سے میرے ذہن میں تھا جہاں ہم کو سمن ٹرائل' وارنٹ ٹرائل اور سیشن ٹرائل کے مختلف مدارج پڑھائے اور سمجھائے گئے تھے۔ مجھے Chattley کی ضابطہ فوجداری میں متعلقہ ابواب میں سے تو یہ کچھ نہ مل سکا۔ البتہ جب دفعہ 107 کی کمنٹری پڑھی تو اس سے مجھے ایک اتھارٹی ملی کہ دفعہ 107/157 کی کارروائی سمن ٹرائل ہوگی اور اس کی بقیہ کارروائی دفعہ 112 سے 117 تک ہوگی اس کی تفصیل پڑھتے ہوئے مجھے دفعہ 116 ضابطہ فوجداری ملی جس کے تحت دفعات 107 تا 110 میں ماخوذ لوگوں کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے جبکہ میری درخواست دفعہ 205 ضابطہ فوجداری کے تحت تھی۔ میں نے فوری طور پر دونوں دفعات پڑھ کر ان کا فرق نوٹ کیا اور Chattley کی کتاب سے متعلقہ اتھارٹی جس کی مکمل رپورٹ وہاں پر میسر نہیں تھی، بھی نوٹ کر لی۔ اگلے روز جب کیس بلایا گیا تو دو وکیلوں کے علاوہ عملے کے لوگ اور باقی بہت سے تماش بین بھی موجود تھے جیسا کہ میرا ہی ٹرائل ہو رہا ہو، میں نے دونوں دفعات پڑھیں ان کا فرق بیان کیا اور دفعہ 116 ضابطہ فوجداری کے تحت استثنا کے لیے press کیا۔

اس کے بعد اس نے ایک تفصیلی حکم کے ذریعہ دونوں دفعات اور ساری کارروائی کو زیر بحث لا کر پانچ آدمیوں کو اصالتاً حاضری سے مستثنیٰ کر دیا۔ حکم انگریزی میں تھا اور موصوف نے قلمی لکھا تھا جس کی ایک کاپی بعد ازاں مجھے بھی دی گئی۔ اس طرح پہلے کیس میں پہلے ہی دن مجھے بہت مشکل اور محنت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کے بعد مجھے ضابطہ کو زیر کار لانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ میں آج بھی اپنے آپ کو اس پنڈت تحصیلدار کا ممنون سمجھتا ہوں جس نے مجھے پہلے ہی دن پڑھنے' محنت کرنے اور تیاری کرنے کی عادت ڈالی۔ اس نے میرا مذاق نہیں اڑایا' میری بے عزتی نہیں کی جیسا کہ آج کل ہم ماتحت عدالتوں اور نوجوان وکیلوں کے درمیان مکالمے سنتے ہیں بلکہ ہائی کورٹ کے جج بھی ایسے وکیل کا مذاق اڑاتے ہیں اور بے عزتی کرتے ہیں جو نو آموز لیکن ترقی پذیر ہوتا ہے۔ اگر اس کی رہنمائی کی جائے تو یہ مٹی بڑی زرخیز ثابت ہو سکتی ہے۔ میں نے پاکستان میں عمومی طور پر دیکھا کہ جج، ججی سے زیادہ دھونس سے کام لیتے ہیں جو ان کے کنڈکٹ ااور عام انسانی صفت کے بھی خلاف ہے۔

کرناہ کا علاقہ چھوٹا سا ہے جس کی آبادی اس وقت بائیس ہزار اور اس کے ساتھ شامل کیرن کی آبادی بارہ ہزار تھی لیکن اس ایک واقعہ سے پوری آبادی میں میرا نام بطور وکیل سامنے آ گیا۔ اور یہ ساری مشق میرے لیے Blessing in Disguise ثابت ہوگئی۔ اس کے بعد تقریباً ہر کیس میں ایک طرف سے میں یقیناً انگیج ہو جاتا تھا۔

اسی عرصہ کے دوران غلام نبی گوہر نامی ایک سینئر سول جج جو چیف جوڈیشل مجسٹریٹ کہلاتا تھا، بطور فارسٹ مجسٹریٹ ہمارے علاقہ کے دورہ پر جنگلات کے مقدمات کی سماعت کے لیے آیا۔ یہ شخص بلا کا لائق اور ذہین تھا۔ اس نے واپسی پر اپنی رپورٹ میں جو ہائی کورٹ کو بھیجی گئی سفارش کی کہ اس علاقہ میں منصف کی عدالت قائم کی جائے جس کو فارسٹ کیسز کی سماعت کا اختیار بھی ہو۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد اس علاقہ میں منصف کورٹ قائم ہوگئی اور نذیر احمد کاؤسہ نامی سرینگر سے تعلق رکھنے والے ایک منصف کی یہاں تقرری ہوگئی بلکہ سرینگر سے تبادلہ ہو کر یہاں تعینات ہوگئے۔ یہ بہت ہی لائق اور دیانتدار شخص تھے۔ انہوں نے انتہائی جانفشانی محنت اور لگن سے عدالتی معیار اور وقار قائم کیا کیوں کہ اس سے پہلے عدالتی اختیارات انتظامی افسران کے پاس ہوا کرتے تھے جو مقدمات کو قانونی لوازمات کے مطابق نہیں بلکہ انتظامی طور چلاتے تھے جس سے بہت سی چیزیں خلط ملط ہو جاتی تھیں۔

اِسی سال کشمیر میں زرعی اصلاحات کا قانون بھی نافذ کیا گیا جو 1950 کی اصلاحات کا ہی تسلسل تھا۔ اس کے تحت *Land to the Tiller* کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد مقدمہ بازی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ قانونی تقاضے پورے کرکے کاشتکاروں کو زیر قبضہ زمین کی ملکیت حاصل کرنے کے لیے بیان حلفی اور وضع شدہ فارم کے بھرنے اور ان کی تصدیق کرنے کی ساری کارروائی وکیل کرتے تھے۔ اس میں بھی لوگوں کے ساتھ متعارف ہونے کا بہت موقع ملا اور پیسے بھی بہت کمائے۔

میرے خیال میں اُسی سال یعنی 1971 میں کشمیر میں عدلیہ کو انتظامیہ سے بھی الگ کیا گیا اور کرناہ میں منصفی کا قیام غالباً اسی علاحدگی کا نتیجہ تھا۔ اس کے تحت تحصیلدار سے لے کر ڈپٹی کمشنر/

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تک کے لوگ ایگزیکٹو مجسٹریٹ اور منصف سے لے کر چیف جوڈیشل مجسٹریٹ تک کے لوگ جوڈیشل مجسٹریٹ قرار دیئے گئے۔ انسدادی نوعیت کے مقدمات کی سماعت جن میں 107 to 110 اور 144/145 ضابطہ فوجداری ایگزیکٹو مجسٹریٹ کے دائرہ اختیار میں دیئے گئے جبکہ تعزیری مقدمات جن میں سزا وغیرہ ہوتی ہو وہ جوڈیشل مجسٹریٹ کے اختیار میں دیئے گئے۔ یہ سسٹم بہت اچھے طریقہ سے اب تک چل رہا ہے۔

شاید سول کورٹس کے ساتھ پورے برصغیر میں ایک جیسا سلوک ہوتا ہے جو اپنا وجود اپنی کارکردگی سے قائم کرتی ہیں نہ کہ حکومت کی مدد سے۔ حکومت جہاں بھی اپنے انتظامی دفاتر بالخصوص تحصیلداری اور تھانہ وغیرہ قائم کرتی ہے۔ اس کے لیے شایانِ شان بلڈنگ یا تو فوری تعمیر کی جاتی ہے یا کرایے پر حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن جہاں عدالت قائم کی جاتی ہے وہ پرائمری سکول کی طرح کے مکان یا کسی انتظامی دفتر کے کونے کھدرے یا کسی درخت کے سایے میں کام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ انتظامی افسران اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کے ایجنڈے پر کام کرتے ہیں جبکہ عدالتیں قانون کے ایجنڈے پر، اسی لیے ترجیح انتظامیہ کو دی جاتی ہے لیکن لوگوں میں پذیرائی حاصل کرنے کے لیے انصاف کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ ہمارے منصف نے بھی ایک دکان کے اوپر اپنی عدالت کھولی اور چار سال تک یہیں کام کیا۔ جب تک کہ سب ڈویژن لیول پر انتظامی سیکرٹیریٹ کی عمارت تعمیر ہوئی جس کے ایک حصہ میں منصف کی عدالت کو بھی دو تین کمرے بطور خیرات مل گئے۔ پاکستان میں اس وقت بھی کئی جگہوں پر ایسا ہی ہو رہا ہے۔

سیاسی زندگی کی شروعات

کرناہ میں میری وکالت اس واقعہ کے بعد خوب چل پڑی اور مجھے ننھیال اور متوقع سسرال کے اثر ورسوخ کی وجہ سے بہت پذیرائی ملی۔ میں زمانہ طالب علمی سے ہی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا رہتا تھا، اس لیے لوگوں کے ساتھ تعلق واسطہ بھی ہر سطح پر تھا۔ ہمارے علاقے کے سب سے بڑے سول

سرکاری افسر ایس ڈی ایم، منصف اور تھانیدار، سول میڈیکل افسر، بلاک آفیسر، رینج آفیسر، بریگیڈیئر وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ میرے تعلقات مدوجزر کا شکار رہتے تھے، آدمی جس جگہ رہتا ہے پھر اسی معیار کا ہی ہو جاتا ہے وہ بھی اس صورت میں کہ زندہ رہنا چاہیے وگرنہ ''ظلوماً جہولاً'' ہی کی مصداق رہتا ہے۔

کرناہ میں اس زمانے میں سیاسی جمود اور ایک مخصوص ٹولے کی اجارہ داری تھی۔ 1956 سے صرف ایک شخص جموں وکشمیر اسمبلی کا ممبر چلا آ رہا تھا جس کا نام خواجہ محمد یونس تھا، اس کے خاندان کے لوگوں کا ہر جگہ' ناجائز تسلط جم گیا تھا۔ عام لوگ ان سے کم اور ان کے خاندان والوں سے زیادہ تنگ تھے۔ گو کہ زبانی طور پر وہ بہت خوش اخلاق انسان تھے لیکن مسلسل ایک ہی انسان اور اس کے حوالے سے ان کے بے لگام حواری جب سیاہ وسفید کے مالک بن جائیں تو ان سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے خوامخواہ بھی دل چاہتا ہے کیوں کہ ترقی پسند لوگ بے قرار طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ اس کو علم سیاسیات میں Anti incumbency Factor کہتے ہیں۔ ان کے مدمقابل کنڈی کا قاضی خاندان تھا جو کئی پشتوں سے علاقے میں دینی اور سیاسی طور پر معزز چلا آ رہا تھا۔ لیکن سیاسی عمل کی وجہ سے خواجگان حکومتی حلقوں میں زیادہ بااثر ہو گئے تھے۔ سیاست میں اثر ورسوخ ہونے کی وجہ سے سول سوسائٹی میں اسی کی قدر کی جاتی ہے جو لوگوں کو نفع ونقصان پہنچانے کی قدرت رکھتا ہو بالفاظ دگر اس کی Nuisance value ہوتی ہے۔ اس نفع ونقصان میں اعتدال نہ برتا جائے تو مزاحمت اور پھر زوال یقینی ہو جاتا ہے۔

مزاحمت کی فضا ہمارے علاقے میں بن گئی تھی جس دوران میں وکالت کے میدان میں آیا، دوستوں کا ماحول بھی مزاحمت والا ہی ملا۔ اس لیے شروع دن سے ہی حزب اختلاف کی سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اسی سال غالباً اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا کہ سرینگر سے ایک وزیر عبدالغنی میر ٹنگڈار کے دورہ پر آئے۔ یہ فوڈ اور ایگریکلچر کے وزیر تھے ان دنوں خوراک کی بندر بانٹ اور اس کی ناقص کارکردگی سے سارے لوگ نالاں تھے۔ منسٹر صاحب کے اعزاز میں شہریوں نے ٹنگڈار ریسٹ ہاؤس میں ایک

استقبالیہ دیا جس میں ایک نوجوان وکیل کی حیثیت سے مجھے بھی بولنے کا موقع ملا میں سب سے زیادہ خوراک کے محکمہ کی بدنظمی اور فوج کے جنگلات کے بے دریغ کٹاؤ کے خلاف بولا جس کی خوب پذیرائی ہوئی۔

ہمارا علاقہ جنگل سے بھرا ہوا تھا جس کو کاٹ کر فوج بالن کے طور اور بڑے افسر تعمیراتی لکڑی کے طور پر اپنے علاقوں میں لے جاتے تھے۔ اتفاقاً لکڑی/ بالن اور خوراک کی ترسیل کا ٹھیکہ علاقے کے ایم ایل اے خواجہ محمد یونس کے عزیزوں اور خواجہ صاحب کے پارٹنر لالہ میلہ رام کا تھا۔ اس ٹھیکیدار کی لوگوں پر بڑی گرفت تھی۔ کیوں کہ اس کا سول اور ملٹری بیوروکریسی میں بہت اثر ورسوخ تھا۔ ذاتی طور پر میلہ رام اور اس کے بچے بہت ہی نیک اور عمدہ صفات کے لوگ تھے اور اپنے علاقے کے لوگوں کی بہت مدد کرتے تھے۔ لیکن ان کے کارندوں سے لوگ بہت ہی نالاں تھے ساتھ ہی خواجہ صاحب کے ساتھ پارٹنرشپ کی وجہ سے یہ لوگ بھی گیہوں میں گھن کے مصداق رگڑے میں آ گئے۔ لالہ میلہ رام بھی جلسے میں موجود تھا جس کو میرا تعارف نہیں تھا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد وہ میرے پاس آئے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرنا ہندوؤں کی تہذیبی علامت ہے جو ہمارے سندھ کے اکثر علاقوں میں بھی ہے۔ انہوں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ آپ کے والد صاحب میرے کلاس فیلو اور دوست تھے، ہم دونوں کلاس میں ایک ہی ٹاٹ پر بیٹھا کرتے تھے اور خواجہ یونس صاحب بھی ہمارے کلاس فیلو تھے۔ اس کے علاوہ دیگر چار پانچ لوگوں کا بتایا۔ اس پر ساتھ کھڑے ایک سیاسی کارکن اختر علی خان نے کہا کہ ''اسی لیے گیلانی صاحب دوستی کا حق نبھا رہے ہیں۔'' اس پر بڑا قہقہہ لگا۔ بہرحال اس واقعہ کے بعد میری اور بھی واہ واہ ہو گئی اور لوگوں کی نظریں مجھ پر جمنے لگیں۔

نئی زندگی کی ابتدا

میں غیر شادی شدہ نوجوان اور سرگرم تھا، اس لیے کئی لحاظ سے مرکز نگاہ بن گیا۔ لیکن زمانے

میں حیا تھی۔اس زمانے میں بیٹے بیٹیوں کے رشتوں کے لیے اخباری اشتہار دینا تو کجا پیغام رسانی بھی بے غیرتی سمجھی جاتی تھی۔تاہم رشتہ دار بے تکلف خواتین دوسرے کی توجہ مبذول کروانے کے لیے آپس میں یا اپنے خاوند یا گھر کے دیگر لوگوں کے ساتھ باتیں کرتیں جو کہ عام گھروں میں ہوتا ہے۔میری ننھیال کے سب لوگ مساوی اور بلا امتیاز عزت کرتے تھے۔میرے ماموں پیر غیاث الدین صاحب کی خواجہ خاندان میں شادی ہوئی تھی جبکہ خالہ کی قاضی خاندان میں۔یہ دونوں خاندان آپس میں متحارب گروپس تھے لیکن ان کی باتیں مجھ تک پہنچنا آسان تھیں۔میرے نانا صاحب مرحوم عالم انسان تھے۔انہوں نے مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش کی اور سمجھانا شروع کیا کہ اب آپ کے گھر بسانے کا وقت آ گیا ہے تا کہ آپ کی عملی زندگی کی تکمیل ہو۔دونوں خاندانوں کے نفع ونقصانات سمجھائے اور ان کے خاندان کے اندر شادی کرنے کی اشارتاً نشاندہی بھی کی۔ان کا ذاتی میلان قاضی خاندان کی طرف تھا کیوں کہ جس خاتون کی طرف ان کا اشارہ تھا، وہ ان کی نواسی اور دلچسپی کا باعث بھی تھی۔یہ خاندان ہمارے گاؤں میں رہتا تھا اور میرے ان کے ساتھ بچپن سے تعلقات چلے آ رہے تھے۔میں ان کے تقریباً ہر گھر کا فرد تھا۔اس خاندان میں جس جگہ کی نشاندہی کی گئی، وہ میری اس خالہ کی بیٹی تھی جس نے میری بھرپور پرورش کی تھی لیکن اسی کے شوہر نے دوران طالبعلمی میرے ساتھ ترش رویہ رکھا تھا۔سب خالاؤں نے میری دل وجان سے بڑھ کر پرورش کی تھی، بالخصوص اس خالہ نے اور بارہ مولہ میں الطاف صاحب کی والدہ نے۔میں چوں کہ خواجہ خاندان کی سیاسی مخالفت کر چکا تھا اور اس لحاظ سے میری ان کے ساتھ موافقت نہیں بنتی تھی، اس لیے میں نے خالہ کے گھر شادی کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

میری بیوی کو اپنے تایا قاضی غلام حیدر مرحوم' جو کہ بے اولاد تھے' نے گود لیا تھا اور وہاں کے رواج کے مطابق یہ ان کی ہی بیٹی تھیں۔قاضی حیدر صاحب اس علاقے کے ایک سرکردہ مذہبی اور سیاسی رہنما تھے۔علاقے کی روایات کے مطابق علاقہ قاضی تھے اور لوگ ان کی بے پناہ عزت کرتے تھے۔مجھے ان کی صورت میں ایک سیاسی سہارا بھی مل گیا۔لیکن ان کی دشمنیاں بھی ساتھ ہی منتقل ہوئیں کیوں کہ ان کے سیاسی مخالف اور حریف میرے بھی مخالف ہو گئے۔اس طرح میری غیر جانبداری متاثر

ہوئی۔میرا سیاسی سماجی اور طبعی میلان بھی اسی طرف تھا۔لڑکی بھی پڑھی لکھی تھی، اس لیے میں نے شادی پر آمادگی کا اظہار کیا۔تاہم قاضی صاحب کے بھائیوں نے ایک شرط عائد کی کہ میرا کرناہ میں اپنا گھر ہونا چاہیے جوان کے نزدیک اس بات کی ضمانت تھا کہ میں بعد از شادی وہیں رہوں۔چنانچہ یہ بات تسلیم کی گئی جس کے لیے مجھے میرے ماموں پیر غیاث الدین صاحب نے ڈیڑھ کنال زمین دی جس پر میں نے 1972 میں مکان بنا لیا۔

وہاں مکان بنانا زیادہ مہنگا نہیں تھا کیوں کہ گارے، پتھر اور لکڑی کا مکان بنتا تھا اور محض مستری اور مزدور درکار ہوا کرتے تھے جو اس زمانے میں بالترتیب ڈیڑھ روپے اور ایک روپیہ یومیہ کے حساب سے میسر تھے، سوائے کارپینٹر کے جو تین سے پانچ روپے یومیہ لیا کرتا تھا۔اس مکان سے پہلے میرے نانا صاحب مرحوم نے میرے اور میری بارہ مولہ والی خالہ کے لیے ایک مکان لیا تھا۔بارہ مولہ ہونے کی صورت میں ہم وہاں رہتے تھے۔وہ مکان اب میری خالہ زاد بہن نے فروخت کر دیا ہے۔اس مکان میں رہ کر میں نے بی اے، ایل ایل بی اور وکالت کے زمانے کے دن گزارے ہیں۔محلہ انتہائی گنجان اور بنیادی سہولتوں سے محروم، مکان اور گلیاں پتھر کی سلوں سے بنے تھے جس میں گندگی کا احساس نہیں ہوتا تھا لیکن ''عشق ومشک نتوان نہفت'' والی بات عیاں تھی۔کرناہ والا مکان 8 اکتوبر 2005 کے قیامت خیز زلزلے کی نذر ہو گیا جہاں اب میرے ماموں زاد بھائی الیاس نے مکان بنا لیا ہے۔

شادی اور سرکاری نوکری

اکتوبر 1971 میں میری شادی علاقے کے رسم و رواج کے مطابق ہوئی جس میں سرینگر اور بارہ مولہ سے میرے مسلمان اور ہندو دوست کثیر تعداد میں شریک ہوئے۔اس وجہ سے علاقے کے لوگوں پر میرا کافی اثر پڑا کہ میں وادی کے اندر لوگوں سے کافی تعلق واسطہ رکھتا ہوں۔اسی سال سول سیکریٹریٹ سرینگر میں **Assistant Legal Remembrance** کی سلیکشن بھی ہو گئی جو انڈر

سیکریٹری کے ہم پلہ پوسٹ تھی، اس لیے مجھے سرینگر شفٹ ہونا پڑا اور وہیں پر میں نے ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ اس بیچ میں ہم چھے لوگ منتخب ہوئے تھے جن میں سے دو سیکریٹری حکومت بن کر ریٹائرڈ ہوئے۔ لیکن میں نے چند ماہ بعد ہی استعفیٰ دے دیا کیوں کہ مجھے جس کام پر لگایا گیا تھا وہ قوانین کا انگریزی سے اردو میں ٹرانسلیشن کرنا اور سرکلر اور نوٹیفیکیشن ڈرافٹ کرنا تھا۔ میں نے ایک روز اپنے محکمے کے سیکریٹری کو کہا کہ مجھ سے کسی ایسی جگہ کام لیں جہاں میں کچھ خدمت کرسکوں۔ اس پر اس نے کہا کہ یہ بھی قومی خدمت ہے جس پر میں نے خود برجستہ کہا کہ آپ نے بھی کبھی ایسی خدمت کی؟ اس پر ہماری تلخی ہوگئی۔ علاوہ دیگر دفتری وجوہات کے نتیجہ میں نے اس پر استعفیٰ دے دیا۔ اتفاقاً یہی سیکریٹری 1974/75 میں ہمارے ضلع بارہ مولہ کے ڈپٹی کمشنر تعینات ہوگئے جہاں ہم نے حکومت کے خلاف کسی مقامی مسئلہ کی وجہ سے کافی پریشانی پیدا کی جس کی وجہ سے اس نے میرے ساتھ رابطہ کیا اور کہا کہ بھائی میں آپ سے معافی مانگتا ہوں وہ انتقام یہاں نہ لو۔ بہر حال میں استعفیٰ دے کر واپس اپنے علاقے میں آ گیا اور دوبارہ وکالت شروع کی۔

سانحۂ مشرقی پاکستان

1970 سے ہی سرحد پر کشیدگی اور گولہ باری شروع ہوگئی تھی حالات کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے گئے۔ اُس کی وجہ مشرقی پاکستان میں شورش سے ہندوستان کا ناجائز فائدہ اٹھانا تھا۔ پاکستان کی فوج کو مغربی سرحدوں پر مصروف کر کے مشرقی پاکستان سے اپنے خلاف مزاحمت ختم کرانے اور اس کو کاٹنے کی کوشش عروج پر پہنچ گئی تھی۔ وادی کشمیر میں اس دوران آتش زدگی کے واقعات ہونے لگے جو ہندوستانی ایجنسیاں مشرقی پاکستان پر ہندوستانی حملے کے خلاف متوقع مزاحمت کی پیش نظر خوف و ہراس پھیلانے کے لیے کروا رہی تھیں۔ کئی لوگ پکڑے بھی گئے لیکن پراسرار طور پر رہا کر دیئے گئے۔ پاکستان میں الیکشن کے نتائج کے برعکس حکومت سازی میں تاخیر، حیلہ بازی اور اس وجہ سے بنگالیوں کو مغربی پاکستان سے متنفر کیا گیا نتیجتاً وہ جنون کی حد تک پاکستان مخالف ہوگئے تھے۔ مجھے سمجھ میں نہیں

74

آتا کہ ہم لوگ صرف اپنی خواہشات کی کامیابی کو ہی کیوں کامیابی سمجھتے ہیں۔ قومی کامیابی تو سب سے بڑی کامیابی ہوتی ہے اگر یحییٰ خان نے اسمبلی کا اجلاس بلایا ہوتا اور بھٹو صاحب نے اپنی انا کی قربانی دے کر مشرقی پاکستان کی اکثریت کا حق تسلیم کیا ہوتا تو آج مشرقی پاکستان بنگلہ دیش نہ ہوتا۔ 2004 کے الیکشن ہارنے پر ہندوستان کے سابق وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے کیا تاریخی بات کہی کہ ''میں ہارا میری قوم جیت گئی۔ میں قوم کو مبارک باد دیتا ہوں۔'' کیا ہم لوگ اپنے اندر وہ کلچر پیدا نہیں کرسکتے، اس کے باوجود کہ دونوں ایک ساتھ اور ایک ہی سامراج سے آزاد ہوئے ہیں، ایک ہی ہمالیہ کی کوکھ سے جنم لینے والے دریاؤں کا پانی اور موسموں سے مستفید ہوتے ہیں!! اگر قومی اسمبلی کا اجلاس ہونے دیا جاتا اگر منتخب اراکین کو آپس میں ملنے دیا ہوتا، اگر ہندوستان کی ریشہ دوانیوں، جس کے ہتھے شیخ مجیب الرحمان چڑھ گئے تھے کو حکومت بنانے کا موقع دے کر حقیقت تسلیم کر لی گئی ہوتی تو نہ ہمیں وہ تاریخی ہزیمت اور رسوائی اٹھانا پڑتی ہوتی جو سرنڈر کر کے ہوئی اور نہ ہی وطن عزیز دولخت ہوتا۔ لگتا ہے کہ اس عبرت سے ابھی تک ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا ہے۔ بلوچستان، فاٹا، سرحد، سندھ، شمالی علاقہ جات اور آزاد کشمیر کے لوگوں کی شکایات کا ازالہ ہو جانا چاہیے قبل اس کے کہ بہت دیر ہو جائے۔ کسی فلاسفر نے کہا ہے:

"History is unfolding of the calculations"

1972 کے الیکشن

مشرقی پاکستان کے سقوط کی ذمہ داری فوجی حکومت اور پیپلز پارٹی پر مشترکہ طور پر عائد ہوتی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد ہندوستان گریز کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے ریاست کو ہندوستان سے آزاد کرانے کا خواب ترک کر کے، ہندوستان سے مفاہمت کا راستہ اختیار کر لیا جس کی انتہا اندرہ عبداللہ کارڈ پر منتج ہوئی۔ اس طرح کشمیریوں کے حوصلے پست ہوئے جو پاکستان کی فوجی سلامتی کے لیے چیلنج ہے۔ اس کے بعد پاکستان بھی شملہ معاہدہ کے بعد اس قدر متحد نہ رہا۔ اس اسٹیٹس کو

کشمیریوں نے 1989 میں چیلنج کیا۔ 1971 کا پورا سال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی عروج پر رہی مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی اور مغربی پاکستان میں سرحدی جھڑپیں رہیں۔ ہم لوگ باڈر ایریا میں رہتے تھے، اس لیے زندگی عذاب بن گئی تھی لیکن اس کے باوجود پوری ویلی کے لوگوں نے کوفیوں جیسا نہیں بلکہ جان ہتھیلی پر رکھ کر جان نثاران جیسا کردار ادا کیا۔ اس دوران فوجوں کو حوصلہ دینے کے لیے ہندوستان کی وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی' ٹنگڈار تشریف لائیں جہاں چنار باغ میں عوامی جلسہ ہوا۔ یہاں پر میں نے چند نوجوانوں کے ساتھ مظاہرہ کرایا جس پر مجھے بعد ازاں حراست میں بھی لیا گیا۔ یہ جلسہ ایک لحاظ سے اس کی الیکشن مہم بھی تھی۔ اس کے دو جملے مجھے آج بھی یاد ہیں کہ '' تاریخ کسی سکول کے بچے کی سلیٹ نہیں جو لکھی اور مٹائی جائے۔ یہ پانی ہے جو بہہ گیا، وہ واپس نہیں آتا۔'' ہمارے مقامی مسئلے کا بھی تذکرہ کیا اور کہا کہ '' دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور آپ لوگ خواجہ اور قاضی کے جھگڑے میں پڑے ہیں۔'' اندازہ لگانا چاہیے کہ قومی لیڈر کو ہر گھر کے معاملات سے باخبر رکھا جاتا ہے اور یہی ملکی سالمیت کی ضمانت ہے۔

ہمارے علاقے میں ہندوستانی فوج، سامنے سے پاکستانی فوج سے اور پیچھے سے عام لوگوں کے خوف سے سہمی ہوئی تھی۔ کشمیریوں اور ہندوستانیوں نے کبھی ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ فوج کو بالن کی سپلائی کی وجہ سے ہماری ان کے خلاف تحریک چل رہی تھی جس سے لوکل سیاست دانوں اور سرمایہ داروں کا روٹی پانی اور فوج کے آرام سکون کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اسی دوران ریاستی اسمبلی اور پارلیمنٹ کے الیکشن بھی منعقد ہوئے۔ اس وقت میرا تعلق جماعت اسلامی کی طلبا تنظیم اور اس کے اخبار '' ترجمان الحق '' سے تھا۔ میں نے 1972 کے اسمبلی اور پارلیمانی انتخاب میں جماعت اسلامی کے حصہ لینے پر مخالفت کی تھی جس بنا پر مجھے جماعت کے نظم کی خلاف ورزی کے جرم میں برطرف کر دیا گیا۔ میرا موقف یہ تھا کہ جماعت کے الیکشن میں حصہ لینے کی وجہ سے جماعت کی دینی اور تعلیمی سرگرمیاں متاثر ہوں گی۔ بالآخر ایسا ہی ہوا اور بہت دیر بعد جماعت کو یہ بات سمجھ آئی۔

اس کے بعد میرا تعلق رسمی طور پر کانگریس پارٹی سے پیدا ہو گیا لیکن ہم نے اسمبلی کے لیے

ان کے امیدوار خواجہ محمد یونس کی بھرپور مخالفت اور آزاد امیدوار یاسین شاہ کی حمایت کی۔ میں نے آزاد امیدوار کے طور پر اپنے کاغذات نامزدگی بھی جمع کروائے جو مسترد ہو گئے۔ سب آزاد امیدواران کا فیصلہ تھا کہ کرناہ کے علاقہ سے عبدالرحمان بڈھانہ اور بقیہ حلقہ سے یاسین شاہ امیدوار رہیں۔ اس زمانہ میں الیکشن میں دھاندلی کی ابتدا کاغذات جمع کروانے والوں کا اغوا اور کاغذات مسترد کر کے منظورِ نظر امیدوار کو بلا مقابلہ منتخب قرار دینا ہوتا تھا جو اس مرحلہ سے نکل جائے تو ووٹنگ میں دھاندلی کا شکار ہو جاتا تھا۔ اس کے لیے ہمیں عبدالغنی لون صاحب کی حمایت بھی حاصل تھی۔ انہوں نے کانگریس امیدواروں کے خلاف پورے ضلع میں اپنے امیدوار کھڑے کیے ہوئے تھے۔ کرناہ کا حلقہ بہت بڑا تھا اور یہاں کے لوگوں کے ووٹ فیصلہ کن ہوا کرتے تھے جن کی اکثریت علاقائی تعصب کی بنا پر خواجہ یونس صاحب کو ملنے کا امکان تھا۔ اس لیے ہم لوگوں نے ایک مقامی امیدوار عبدالرحمن بڈھانہ کو بھی الیکشن میں کھڑا کیا ہماری ترکیب کامیاب ہوگئی اس نے علاقہ کے گجر ووٹ (جس برادری سے یہ تعلق رکھتا تھا) اور یونس مخالف ووٹ حاصل کر کے اس علاقہ سے طاقت کا توازن بگاڑ دیا جس وجہ سے کانگریس امیدوار خواجہ یونس ہار گیا۔

کرناہ میں بسنے والی سکھ برادری کے ساتھ میرے خصوصی تعلقات تھے '' جوتری بونی '' گاؤں میں رہتے تھے۔ ان لوگوں نے الیکشن میں ہمارا بھرپور ساتھ دیا اور ہر جگہ تحفظ فراہم کیا۔ ان میں نمایاں موہن سنگھ، جوگندر سنگھ، بلدیو سنگھ' پریتم سنگھ' تھے جن کی تمام سکھ عزت کرتے تھے۔ اس تحریک میں میرا کردار نمایاں تھا' جس وجہ سے عبدالغنی لون مرحوم میری بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ لون صاحب نے اس وقت کے چیف منسٹر مرحوم سید میر قاسم اور کانگرس کے صدر مفتی محمد سعید' سے مجھے ملوا کر کہا کہ '' اس جوان نے آپ کی مٹی پلید کی ہے۔ اگر آپ نے ٹکٹ کا صحیح فیصلہ کیا ہوتا تو آج آپ کا یہ حشر نہ ہوتا۔'' اس پر میر قاسم نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے لون صاحب کو کہا کہ '' اگر آپ نے ہی صحیح فیصلہ کیا ہوتا تو پھر بھی ایسا نہ ہوتا۔'' لون صاحب آئندہ الیکشن کے لیے مجھے تیار کر رہے تھے اس لیے مجھ پر بھرپور توجہ دیتے تھے۔ اس الیکشن میں ہم نے اس علاقہ میں سیاسی جمود توڑ کر ایک غریب آدمی عبد

الرحمن بڈھانہ کو آگے آنے کا موقع دیا جو واقعی اس قابل تھا گو کہ یہ کبھی الیکشن نہیں جیت سکا لیکن کشمیر کی قانون ساز کونسل میں دوبارہ ممبر منتخب ہوا۔ زمانہ کے نشیب و فراز ایسے ہی ہوتے ہیں کہ یہی بڈھانہ جو لالہ میلہ رام اور خواجہ یونس کے ساتھ قلی یا میٹ کا کام کرتا تھا، ان کے بالمقابل لیڈر کھڑا ہو گیا اور آج علاقہ کرناہ بلکہ پوری ریاست میں شیڈول کاسٹ کا لیڈر سمجھا جاتا ہے۔

کیا رکھا ہے ذاتوں میں
انسان کھلونا ہے تقدیر کے ہاتھوں میں

سقوطِ ڈھاکہ۔ ڈیفنس آف انڈیا رولز اور عبدالغنی لون

جہاں دسمبر 1971 میں کشیدگی میں تیزی آ گئی تھی، وہیں ہندوستانی فوج کی مشرقی پاکستان میں مداخلت بھی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ مغربی پاکستان میں اور بالخصوص کشمیر میں اس وقت فوج مکمل محاذ نہیں کھولنا چاہتی تھی، اس لیے لوکل شورش کو دبانے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے گئے۔ جن میں مکانوں کو آگ لگانا بھی شامل تھا۔ 15 دسمبر 1971 کو مرحوم خواجہ عبدالغنی لون جو اس وقت کشمیر حکومت میں منسٹر تھے ہمارے علاقہ کے دورے پر آئے۔ ٹنگڈار میں آ کر سب سے پہلے انہوں نے مجھے تلاش کروا کر کہا کہ ''تم تیاری کرو تم نے ہمارے ساتھ بارہ مولہ جانا ہے۔'' ان حالات میں میرا گھر سے نکلنا مشکل تھا میں نے حیلہ بہانہ کیا لیکن وہ نہ مانے اور ٹنگڈار میں ایک مختصر سا جلسہ کر کے مجھے کہا کہ ''میری جیپ میں بیٹھو گھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس جلسہ کے دوران ہی ان کو غلام محمد صادق سابق چیف منسٹر کی وفات کی خبر ملی جس وجہ سے وہ جلسہ ادھورا چھوڑ کر واپس ریسٹ ہاؤس چلے گئے۔ ان دنوں لُون صاحب کی حکومت سے ان بن ہو گئی تھی۔ صادق صاحب کے فوت ہونے کا سن کر موصوف نے کہا کہ ''ہم نے ایک دیانتدار' ڈیموکریٹ کو چھوڑ کر ایک بے کار آدمی کا ساتھ دیا یہ ہماری بہت بڑی غلطی تھی اللہ پاک ہمیں معاف کرے۔'' اس وقت لون صاحب کانگریس کے ہم نوا گروہ میر قاسم کے روح رواں ہو گئے تھے۔ میں نے منشی کو پیغام دے کر گھر بھیج دیا اور خود لُون صاحب کی جیپ میں بیٹھ کر بارہمولہ نکل گیا۔ انہوں نے اس دن کا کھانا ''سادھنا''، یعنی ''ننھا چھنا گلی'' پر فوجیوں کے ساتھ کھانا تھا۔

ہم تقریباً آٹھ لوگ تھے جوان کے ہمراہ گیسٹ روم میں چلے گئے۔ یہاں ایک سکھ فوجی کرنل نے میس کے دروازے پر استقبال کیا۔ چائے سے ہماری تواضع ہوئی اور دو بجے کے قریب ٹیبل پر standing lunch رکھ دیا گیا۔ ہم لوگ کھانا کھا ہی رہے تھے کہ ایک نوجوان فوجی کیپٹن نے کرنل صاحب کو سلیوٹ مار کر کہا کہ سر task is complete اس پر وہاں موجود چھ سات فوجیوں نے جے ہند کا نعرہ لگایا یہ ہمارے لیے ایک سرپرائیز تھا کہ پُرامن اور کھاتے پیتے ماحول میں یہ کیا ہو گیا ہے۔ کرنل نے کہا کہ منتری صاحب مبارک ہو، پاکستانی فوج نے ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اب جرنل اروڑا تقریر کرنے والے ہیں۔ ہمارے تو اوسان خطا ہو گئے۔ مرحوم غنی لون صاحب کے ہاتھ سے پلیٹ گر گئی اور وہ تقریباً حواس باختہ ہو کر کشمیری میں کہنے لگے کہ ''منظور یہ کیا ہو گیا ہے؟'' کرنل نے یہ کیفیت دیکھ کر ہمارے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے کہا کہ ''پریشانی کی بات نہیں ہے جی، ہماری فوج نے نہیں دشمن کی فوج نے ہتھیار ڈالے ہیں۔''

وہاں سے فارغ ہو کر ہم لوگ آگے کی طرف روانہ ہوئے۔ سرینگر تک لون صاحب رو رہے تھے اور بس ایک ہی بات کہتے تھے کہ ''اب برصغیر کے اور کشمیر کے مسلمانوں کو یہ لوگ تلک لگوائیں گے۔'' انہوں نے صادق صاحب کی وفات کو بھی اسی صدمے سے جوڑا اور یہ غلط بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ کشمیر کے مسلمان لیڈر پاکستان کی مضبوطی سے ہی سیاسی طاقت حاصل کرتے ہیں۔ سرینگر پہنچ کر لون صاحب نے مجھے کہا کہ ''تمہارے خلاف ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت وارنٹ جاری ہوا ہے۔ تم کل پہلی فرصت میں جا کر اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کروا لو۔'' میں نے اگلی صبح سرینگر ہائی کورٹ میں جا کر اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کروائی اور ایک ہفتہ کے بعد واپس کرناہ آ گیا۔ میرے خلاف یہ کارروائی اسی سیاسی رقابت کی وجہ سے کروائی گئی تھی اور الزام سے یہ بات مترشح ہوتی تھی کہ یہ شخص لوگوں کو فوج کے خلاف اکساتا ہے۔ حالاں کہ ہماری ایک جینوئن ڈیمانڈ تھی کہ فوج کو جنگل سے بالن کی بجائے کوئلہ یا کیروسین آئل دیا جائے۔ بالآخر ہمارا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے 1972 کے اواخر میں بالن کے لیے لکڑی سپلائی پر پابندی لگ گئی۔ اس طرح ہماری سیاسی ساکھ مضبوط اور قومی دولت محفوظ ہو

گئی۔

اسی زمانے میں ڈیفنس آف انڈیا رولز پبلک سیفٹی ایکٹ + مینٹی نینس آف پبلک آرڈر جیسے انتقامی قوانین کے تحت کارروائی ہوا کرتی تھی۔ جبکہ اب پوٹہ، ٹاڈا اور آرمڈ فورسز سپیشل پاورز ایکٹ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ان قوانین کے تحت فوج کو موقع پر گولی مارنے، جائیداد تلف کرنے اور مکان جلانے کا اختیار مل گیا ہے۔ اس زمانہ میں لوگ فوج کا مقابلہ بندوق سے نہیں بلکہ پتھروں' کانگڑیوں، اور نعروں اور جلسوں سے کرتے تھے۔ اس کا مقابلہ اوّل الذکر نرم قوانین کے ذریعہ ہوا کرتا تھا اور 1990 کے بعد جب بندوق آئی تو اس کے مقابلہ میں نئے قوانین وجود میں آ گئے۔ اب پہلے کے مقابلہ میں نقصان زیادہ اور سیاسی فائدہ کم ملتا ہے۔ تاہم مسئلہ نے بہت اہمیت حاصل کر لی، گو کہ اس کے منفی اثرات زیادہ مرتب ہوئے ہیں۔ اب بندوق کے بند ہونے اور انتفادہ کے پرانے عمل نے کشمیر کے مسئلے کو دنیا میں پھر اجاگر کر دیا ہے اور ہندوستان Defensiive ہو گیا ہے۔

اس دوران میں میری بیوی کی تقرری بطور ٹیچر ہو گئی اور اس کو ٹریننگ کے لیے سوپور ٹریننگ سکول میں بھیجا گیا۔ اس وقت ہمارے دو بچے تھے جن میں سے چھوٹی بیٹی فہمیدہ تھی۔ مجھے دن بھر اس کا خیال رکھنا پڑتا تھا کیوں کہ وہ بہت رویا کرتی تھی اور اس کے رونے کی وجہ سے مجھے بہت کوفت ہوتی تھی۔ اب ماشاءاللہ فہمیدہ بھی ماں بن گئی ہے اور اس نے اپنے نام کی لاج رکھی ہے یعنی سمجھدار ہے۔ میں نے اس عرصہ میں بارہ مولہ میں وکالت شروع کر دی جہاں میں پہلے صرف اپیل یا نگرانی کے کیسز میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے پاس آیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بارہ مولہ کی ضلع بھر کی عدالتوں میں جہاں بھی کیس ملتا تھا میں اپنی ڈائری کے مطابق ان کی تاریخیں مقرر کروا لیتا تھا۔ بارہ مولہ اس زمانے میں ہمارے علاقے کا ضلعی ہیڈ کوارٹر بھی ہوا کرتا تھا، اس لیے میں نے اپنا مکمل ٹھکانا یہیں رکھا تھا۔

مجھے اس وقت کا ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے جو غالباً 1973 کی بات ہے کہ ہمارے گاؤں کے ایک درزی رستم نے ایک بیوہ سے شادی کر لی جس کے رشتہ داروں نے اس کے خلاف اغوا کا پرچہ درج کروا دیا۔ یہ سیشن کیس تھا اس لیے ان دونوں کو تاریخ بھگتنے کے لیے بارہ مولہ آنا پڑا۔ رات کو بارہ مولہ

ہمارے گھر میں رہے اور صبح کو مجھے انہوں نے کہا کہ پیر صاحب ہمیں کوئی[74] اچھا سا وکیل کر دیں تا کہ ہماری جان چھوٹ جائے۔ مجھے اس بات پر بہت غصہ آیا اور پوچھا کہ تمہارا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے کہا کہ آپ تو ہیں ہی گھر کے کسی اور کو مقرر کروائیں۔ میں پیسے بھی دوں گا۔ گاؤں والے اپنے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرتے ہیں۔ اسی لیے ہماری پہاڑی زبان میں مقولہ ہے کہ ''گھر کا پیر ہولا ہوتا ہے۔'' میں نے ان کو اپنے ساتھ کام کرنے والے وکیل اقبال کو مقرر کروا دیا۔ اس طرح بہ یک وقت میرا اور ان کا کام ہو گیا۔

ان دنوں عبدالغنی لون مرحوم کشمیر حکومت میں صحت اور تعلیم کے وزیر بھی تھے۔ وہ میری پروجیکشن کے لیے ہمارے علاقے میں آئے۔ وہ ہمت، جرأت اور بے باکی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ میں نے ان کا بھرپور اور والہانہ استقبال کروایا۔ انہوں نے جلسہ کی صدارت مجھ سے کروائی تا کہ لوگوں کو میری اہمیت کا اندازہ ہو۔ میرے مطالبے پر کنڈی ہائی سکول کو ہائیر سیکنڈری سکول کا درجہ' علاقے میں دو نئے ہائی سکول' جہاں دس بچے ہوں وہاں ایک پرائمری سکول، پرائمری ہیلتھ سینٹر کو سب ڈسٹرکٹ ہاسپٹل کا درجہ اور کرناہ کے علاقے کے لیے میڈیکل، انجینئرنگ کالج میں دو سیٹیں بھی مختص کیں۔ اس کے علاوہ بے شمار لوگوں کو نوکریاں بھی دیں۔ مرحوم پورے کشمیر میں بہادر اور کھرے انسان سمجھے جاتے تھے۔

کچھ عرصہ کے بعد حکومت کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے انہوں نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور کھلے عام مرکزی اور ریاستی حکومت کے خلاف مہم چلانا شروع کر دی۔ مرحوم اس وقت سرینگر میں لبریشن فرنٹ کی حمایت کرتے تھے اور ان کے ذریعے ہنگامے اور جلسے جلوس کرواتے تھے۔ گو کہ کشمیر میں لبریشن فرنٹ کی کوئی ساکھ یا حمایت نہیں تھی لیکن اس کے نام کو پروجیکٹ کیا جا رہا تھا اور لون صاحب ان کی بھرپور مدد کرتے تھے، غالباً اسی قربت کی وجہ سے ان کے بیٹے سجاد کی شادی لبریشن فرنٹ کے مرکزی اور باجرأت رہنما امان اللہ خان صاحب کی بیٹی سے اسلام آباد میں ہوئی۔ حکومت سے شدید ٹکراؤ کی وجہ سے لون صاحب کو چند دیگر لوگوں کے ساتھ 1974 کے وسط میں Defence of India Rules (DIR) کے تحت نظر بند کیا گیا۔ میں ان دنوں سوپور میں تھا۔ ان کے چند دوست مجھے

تلاش کرتے ہوئے ادھر آ گئے اور سوپور میں چیف جوڈیشل مجسٹریٹ کے پاس ہم نے ضمانت کی درخواست دی۔ اگلے دن بحث مقرر ہوئی۔مکھن لال کول جج تھے جو کہ بعد میں ہائی کورٹ کے جج بھی مقرر ہوئے۔ میری بحث کے جواب میں پبلک پروسیکیوٹر نے بہت مضبوط بحث کی اور لون صاحب کی مختلف جگہوں پر تقریر کا حوالہ بھی دیا جو انتہائی اشتعال انگیز تھیں۔اس نے بے شمار کتابیں بھی ریفر کیں۔ جج صاحب نے کسی قانونی نظیر کے حوالہ پر کہا کہ مسٹر پی پی قانون زیادہ نہ دکھاؤ۔

Law is what the Judges say and they do. یہ کہہ کر سٹینو کو بلوا کر محض ایک صفحہ کی ڈکٹیشن دی اوران کی ضمانت کردی۔جج صاحب کے حکم کا ایک جملہ مجھے بار بار یاد آتا ہے، Dissenting voice is freedom of expression۔

ہم لوگ ان کی رہائی کا پروانہ لے کر جیل میں گئے جہاں سے ان کو جلوس کی صورت میں لائے۔لون صاحب نے کہا کہ ''تم نے فوراً ہی قرض چکا دیا۔'' نہ معلوم یہ میری کمزوری ہے یا ایمان کی پختگی ہے کہ مجھے جس کے خلوص پر یقین ہوجائے اور جس نے خلوص سے میرے ساتھ احسان کیا ہو، میں جب تک اس کا احسان نہ چکاؤں مجھے اطمینان نہیں ہوتا۔یہی ایمان کا تقاضا ہے کہ **ھل جزاء الاحسان الا الاحسان**۔لون صاحب کے ساتھ میری وابستگی ان کی زندگی تک اوران کے بچوں کے ساتھ میرا پیار اب تک قائم ہے اور وہ لوگ بھی میرے لیے ایسے ہی جذبات رکھتے ہیں۔ جو شخص کسی غرض کے ساتھ میرے ساتھ مروت کرتا ہے نہ معلوم اس کی مروت کا میرے جذبات اور احساسات پر اثر کیوں نہیں ہوتا، ایسی مروت میں عموماً محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ مروت کسی خلوص پیار یا فی سبیل اللہ نہیں' بلکہ کسی غرض وغایت سے کی گئی ہے۔ میں اس کا بدلہ بھی ضرور ادا کرتا ہوں لیکن یہ راز بالآخر افشا ہو ہی جاتا ہے۔ایسے کئی واقعات میرے ساتھ ہوئے ہیں بالخصوص آزاد کشمیر آنے کے بعد جن کا تذکرہ مناسب اور متعلقہ مقامات پر کیا جائے گا۔جن لوگوں پر میں نے بڑے بڑے اور صاحب اقتدار لوگوں کی ناراضی مول لے کر احسان کیا، ان کے ہاتھوں مجھے بالواسطہ اور بلاواسطہ نقصان پہنچا۔جب کسی ایسے آدمی سے مجھے نقصان یا تکلیف پہنچتی ہے تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے کہ میری نیکی قبول ہوگئی کیوں کہ

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جس پر احسان کرو، اس کے شر سے بچو۔ میں اس وقت سمجھتا ہوں کہ احسان کی صورت میں میری نیکی قبول ہوگئی ہے۔

کرناہ میں وکالت کے دوران میرے ساتھ کئی ایسے واقعات پیش آئے جن میں حکمت عملی اور تدبر سے کام لے کر بہت سے فتنے مٹانے کا موقع ملا اور اپنے لیے حصول منافع کی بجائے لوگوں کے فائدے کو مدنظر رکھا جس کے مجھے بہت دوررس فوائد حاصل ہوئے۔مثلاً حکومتی امیدوار اور حکومتی پارٹی کے خلاف لوگوں کی خاطر صف آراء ہونا، اپنی کامیابی کے امکانات ہونے کے باوجود 1971 کے الیکشن میں ایک گجر امیدوار کو جو بے سروسامانی اور غیر معروف لیکن باصلاحیت تھا، کو آگے آنے کا موقع دینا، کئی بڑے بڑے اراضی اور قتل کے مقدمات جو خانہ جنگی تک پہنچ گئے تھے کے فریقین میں مصالحت نامہ کروانا مثلاً متذکرہ بالا سکھوں کے درمیان سردار ہیرا سنگھ کے قتل میں فریقین کا راضی نامہ کروا کر سکھوں کو خانہ جنگی سے بچانا اور شرفا کی لڑکیوں کے اغوا میں ان کی مدد کر کے ان کی عزت بچانا وغیرہ۔زندگی بھر وکالت اور منصفی کے دوران بھی میرا یہی رجحان رہا، میں سمجھتا ہوں میرے اس عمل کے پیچھے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ''الصلح بالخیر''۔

CCM(Civil Court Manual) حلف

اسی دور کی بات ہے جب مجھے ایک عجیب مقدمے کا سامنا کرنا پڑا جو نہایت ہی دلچسپ اور دوررس نتائج کا حامل رہا۔(پنجگراں) ''پنسز گام'' جو تحصیل کپواڑہ میں واقع ایک گاؤں ہے، کے ایک باعزت اور کھاتے پیتے آدمی احمد اللہ کی لڑکی استانی تھی، اس کو ہمارے علاقے کا ایک استاد جس کا نام مقبول تھا، اغوا کر کے لے آیا۔ یہ دراصل اغوا نہیں تھا بلکہ وہ لڑکی اپنی مرضی سے اس کے ساتھ شادی کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی کیوں کہ اس کے والدین اس کا رشتہ وہاں نہیں دینا چاہتے تھے۔اس زمانے میں ایک عام رواج تھا' جو کہ آج کل بھی چل رہا ہے کہ لڑکی یا لڑکا والدین کے خلاف ض ف 107 کی درخواست دائر کر کے اپنا مدعا بیان کر کے شادی کر لیتے تھے جو اغوا کے مقدمہ کی

صورت میں بطور دفاع پیش کیا جاتا تھا۔ مقبول اس لڑکی کو لے کر عدالت میں آیا۔ اگلے روز عدالت میں اس لڑکی کا بیان ہونا تھا اس کے باپ نے مجھے اپنا وکیل مقرر کیا۔ میں نے درخواست دی کہ لڑکی کو ورغلا کر اور بہلا پھسلا کر اغوا کیا گیا ہے، اس لیے بیان لینے سے پہلے اس کو آزادانہ طور پر سوچنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ جج نے اتفاقِ رائے سے لڑکی میرے سسر کے حوالے کی کہ وہ قاضی صاحب کی تحویل میں رہے گی۔ میں نے لڑکی سے اپنے طور اپنے گھر میں اطمینان کر لیا کہ وہ کسی طور اس لڑکے سے ہٹ کر کچھ قبول کرنے کو تیار نہیں۔ میں نے اس کے والدین سے بات کی کہ لڑکی کی شادی اس لڑکے سے کر دی جائے کیوں کہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنے کی صورت میں ان کی عزت بھی بحال رہے گی۔ انہوں نے مجھے جُل دے کر بخوشی یہ مان لیا لیکن لڑکی کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھی کہ وہ والدین کے پاس چلی جائے جو خود اس کو بیاہ کر اس لڑکے کو دیں گے۔ بہرحال میں نے ایک قانون کی کتاب جو کہ کافی ضخیم تھی اور مدراس سے جاری ہونے والے بائیس وولیم کا ایک حصہ سول کورٹ مینول تھا، پر قرآن کریم کا غلاف چڑھا کر لڑکی کو قسم دی اور خود بھی لی کہ وہ والدین کے ساتھ جائے جس کی شادی بالآخر اسی لڑکے سے کر دی جائے گی۔ چنانچہ لڑکی اس پر آمادہ ہوگئی اور اپنے والدین کے ساتھ چلی گئی۔ لیکن مجھے دکھ ہے کہ اس کے والدین نے دھوکہ دیا اور لڑکی اس لڑکے کو بیاہ کر نہیں دی جو بالآخر خود بھی اس سے شادی کرنے پر مصر نہیں رہی۔ ایسا کرنے میں میرے نزدیک شیخ سعدی کا یہ قول تھا:

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی شر انگیز است

یعنی مصلحت پر مبنی جھوٹ، فساد پیدا کرنے والے سچ سے بہتر ہے۔ میں آج بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں نے اچھا کیا تھا کیوں کہ کرناہ کے اکثر لوگوں کی کاروباری سرگرمیاں اسی گاؤں سے ہوا کرتی تھیں جہاں اس لڑکی کا باپ رہتا تھا۔ وہ سردیوں گرمیوں میں کاروباری مال کی ترسیل کے ایجنٹ کے طور کام کرتا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو کرناہ اور اس علاقے کے لوگوں کے درمیان جنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی جس سے ہماری معیشت اور امن برباد ہو جاتا۔ علاقے کے لوگ اس عمل کو تحسین کی نظر سے دیکھتے

ہیں اور اس حلف کو (CCM) حلف کے طور یاد کرتے ہیں۔ (Civil Court Manual)۔ میں ذاتی طور والدین کو اعتماد میں لے کر پسند کی شادی کے حق میں ہوں۔ والدین کا کام اولاد کو سمجھانا ہے، دبانا نہیں۔ ان کی رضامندی کے بغیر شادی کرانا استحصال بالجبر ہے۔ لیکن ہماری تہذیبی روایات میں اولاد کو بھی ان قدروں کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے تاکہ خاندان اور والدین کی عزت پر حرف نہ آئے۔ اب معاشرے کی قدریں بدل رہی ہیں۔ ممکن ہے چند سال بعد معاشرے کی یہ تہذیبی قید بدل جائے اور بدلنا بھی چاہیے۔ اگر والدین بیٹی (بالخصوص) یا بیٹے کی پسند کے مطابق شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو اس کا فطری ردِعمل یہی ہوتا ہے کہ لڑکا لڑکی کسی اور طریقے سے یہ فریضہ انجام دیتے ہیں، بہتر ہے کہ دونوں کو نیک و بد سمجھا کر شادی کرنے کا موقع دینا چاہیے، یہی دین اور یہی انصاف ہے۔

؎ جرم ہم نے کیا ہے، جرمِ وفا   کوئی ایسا دغا نہیں کرسکتا

مقامی عدالتیں۔ بارڈر کراس کیس اور انسانی رویے

جنگ بندی لائن کے دونوں اطراف رشتہ دار لوگ رہتے ہیں اس لیے اکثر اِدھر اُدھر سے آتے جاتے پکڑے جاتے تھے۔ ان لوگوں کی سرگرمیوں کو سختی سے دبایا بھی نہیں جاتا تھا، البتہ اس وقت نافذ العمل قانون (IEMCO) یعنی (Ingress and Eagress Movement Control Order کی دفعات 2/3 کے تحت علاقہ مجسٹریٹ کے پاس چالان پیش کیا جاتا جو کہ معاملہ کی نوعیت کے مطابق جرمانہ یا قید کی سزا دیتا جس کی زیادہ سے زیادہ حد تین سال قید یا دو ہزار روپیہ جرمانہ تھی۔ ایسے مقدمات میں عموماً لوگ اقبالِ جرم کر کے مہینہ بھر قید یا پانچ سے آٹھ سو روپے جرمانہ ادا کر کے جان چھڑا لیتے تھے۔

میں نے چھتکڑی گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک خاندان کی وکالت کرتے ہوئے ان سے کہلوایا کہ انہوں نے سرحد عبور نہیں کی، اس لیے وہ جرم کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔ یہ خاندان اب آزاد کشمیر میں ہجرت کر کے آگیا ہے۔ اس پر سکیورٹی ایجنسیاں اور پولیس حرکت میں آ گئی۔ منصف

نے بھی مجھے کہا کہ ''یار کس مصیبت کو دعوت دی ہے، ان سے اقبالِ جرم کراؤ۔ان کو میں تابرخاست کچہری سزا دے کر چھوڑ دوں گا۔'' لیکن میں نہیں مانا۔اس کیس میں میرے دو دلائل تھے ایک تو یہ کہ یہ لوگ پاکستان سے غیر قانونی طور پر نہیں آئے بلکہ چھتنکڑ یاں گاؤں کے ہی رہنے والے ہیں۔اس گاؤں کے دوسرے حصے سے آئے ہیں۔کاغذات پٹوار میں یہی درج ہے۔دوسرا یہ کہ ان کے خلاف ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ پہلا تو قانونی تھا کہ آزاد کشمیر کا علاقہ ہندوستان اور کشمیر کے آئین کے تحت کشمیر کا حصہ ہے اور یہ لوگ ریاستی باشندے ہیں جن کو پورے کشمیر میں چلنے پھرنے کی پوری آزادی ہے جبکہ دوسرا واقعاتی تھا کیوں کہ کسی بھی گواہ نے ان کو سرحد عبور کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔بحث کے وقت جج جس کا نام جھنکار سنگھ چمیہ تھا، مطمئن ہو گیا کہ پورا کشمیر ایک ہے۔ ہندوستان اور کشمیر کے آئین کے تحت ہندوستان کا حصہ ہے جبکہ یہ بھی فی الواقع ثابت نہیں ہوا تھا کہ وہ سرحد عبور کر کے آئے تھے کیوں کہ ان لوگوں کے گھر چھتنکڑی گاؤں میں موجود تھے جہاں ان کا باقی خاندان مقیم تھا لیکن جج نے صرف دوسرے نکتہ پر ان کے خلاف مقدمہ خارج کر کے ان کو بری کر دیا۔جب میں نے اس کو پوچھا کہ آپ نے پہلے نکتہ پر فیصلہ کیوں نہیں کیا تو اس نے کہا کہ یار یہ آئینی اور سیاسی نکتہ ہے بہتر ہے کہ اس پر ہائی کورٹ ہی کوئی فیصلہ کرے، آپ اپیل کریں۔اس نے مزید کہا کہ ''عدالتوں کو ہر نکتہ پر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی ہر نکتہ فیصلہ طلب ہوتا ہے۔جب ایک نکتہ پر کسی کو ریلیف مل سکتا ہو تو صرف اسی پر فیصلہ کرنا چاہیے۔ ابتدائی عدالتیں واقعاتی عدالتیں ہیں ان کو اس حد تک محدود رہنا چاہیے۔'' مجھے اس منصف' جو ابتدائی درجہ کا جج تھا، کی یہ بات بہت پسند آئی، جو ہماری اعلیٰ عدلیہ کے ججوں کو آج تک سمجھ نہیں آرہی یا سمجھنا نہیں چاہتے۔

پاکستان میں جو آئینی اور سیاسی بحران پیدا ہوا ہے اس میں زیادہ قصور اعلیٰ عدالتوں کا بھی ہے کیوں کہ عدالتوں نے ایسے ایسے قانونی نقطوں پر فیصلے کیے ہیں جن پر نہیں ہونا چاہیے تھے۔اسی لیے آج قانون اور آئین سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا ہے اور سیاسی طوائف الملوکی پیدا ہوئی ہے۔جب مجھے درج بالا قانونی نکتہ پر بحیثیت جج فیصلہ کرنے کا موقع ملا میں نے قرار دیا کہ کشمیر کے دونوں حصے

70

74

ریاست کا حصہ ہیں اور اس کے باشندے ریاست کے ہر حصے میں یکساں طور چلنے پھرنے اور سکونت اختیار کرنے کا حق رکھتے ہیں اور جب تک ریاست کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوتا، پاکستان اور آزاد کشمیر کے آئین کے تحت آزاد کشمیر پاکستان کا حصہ ہے اور ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے لیے غیر ملکی ریاست نہیں ہے۔میں نے یہ بھی قرار دیا کہ ریاست کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں آنے جانے والے لوگوں کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسے مکان کے اندر کمرے تبدیل کر دیئے جائیں۔اس سلسلہ میں درج ذیل رپورٹڈ کیس ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

1. Ghulam Hussain & Others v/s Fedral Govt. of Pakistan (PLD 1993 AJK 1531)

2. Ali Asghar Abbasi v/s AJK Council (PLD 2001 AJK 33)

اس وقت پیش آنے والے وکالت کے تین اور واقعات مجھے اور اس علاقے کے لوگوں کو کبھی نہیں بھولیں گے۔سدھپورہ گاؤں سے تعلق رکھنے والے ایک آدمی جس کو سائیں جمعہ یا سائیں اکبر کہا کرتے تھے جو بعد میں آزاد کشمیر آ کر یہیں فوت ہو گیا۔یہ شخص کسی مقدمہ کے سلسلہ میں عدالت میں متذکرہ بالا جج کے پاس پیش ہوا۔جج نے اس کی کسی مجنونانہ حرکت پر اس کو گیٹ کی سیڑھیوں پر مرغا بنا کر کان پکڑائے اور اس کی پیٹھ کے اوپر ایک بڑی سل رکھ دی۔ جب میں نے یہ دیکھا تو میرا خون کھول اٹھا۔میں نے اس کی پشت سے پتھر کی سل اٹھوائی۔اس کو کھڑا ہونے کو کہا۔اس کے نہ ماننے پر میں نے اس کو زبردستی کھڑا کیا جس پر بہت شور پڑ گیا۔جج بھی باہر نکل آیا اور اس نے اس شخص کو دوبارہ ایسا کرنے کو کہا لیکن میں نے ایسا نہ کرنے دیا۔حالات کی نزاکت کو دیکھ کر جج خاموش ہو گیا اور مجھے کمرے میں لے جا کر گلہ کیا کہ اس سے عدالت کا رعب دبدبہ اور احترام مجروح ہوا ہے جس پر میں نے اس کو بہت لتاڑا اور ہائی کورٹ میں شکایت کرنے کی دھمکی دی۔اس کے بعد اس کو احساس ہوا کہ حالات بہت خراب ہیں۔میں نے اس کو کہا کہ معاملہ ختم کرنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اس سائیں سے معافی مانگیں اور ان تمام لوگوں کے سامنے مانگیں جنہوں نے اس کو اس حالت میں دیکھا

ہے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ اس کو چیمبر میں بلوا کر چائے پلوائی جائے اور وہاں معذرت کی جائے اور ایسا ہی ہوا۔

دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ منشی اختر علی خان جو کہ عرائض نویس اور علاقے کے معتبر لوگوں میں سے تھے، کے والد منشی صفدر علی خان فوت ہوئے۔ اسی جج نے غلام حیدر نامی ایک چپراسی کو کہا کہ منشی اختر علی کا پکارا کر کے بلاؤ اس کے باپ کی وفات پر افسوس کرنا ہے۔ چپڑاسی نے پکارا تو کر دیا لیکن میں نے چپراسی اور جج کی بھری عدالت میں بے عزتی کی کہ ایک شخص کے ساتھ آپ اظہار ہمدردی کرتے ہیں اور وہ بھی تحکمانہ طور پر یہ تو اس شخص کی توہین ہے۔ اس پر بھی کافی تلخی ہوئی لیکن بال آخر جج نے معذرت کی۔ اس سے اسی علاقے کے لوگوں میں اس وجہ سے کافی حوصلہ افزائی ہوئی اور کافی جرأت اور ہمت پیدا ہوئی۔ بدقسمتی سے سرحدی علاقے کے لوگ ایجنسیوں اور انتظامیہ کے خوف سے بزدل اور چغل خور بن جاتے ہیں۔

میرے پاکستان آنے کے بعد یہ منصف سیشن جج کے طور ریٹائر ہوا اور وہ ان واقعات کا ذکر اکثر کیا کرتا تھا۔ میں جب 2004 میں جموں گیا۔ وہاں جہلم ہوٹل میں ٹھہرا تھا، یہ شخص خصوصی طور پر مجھے ملنے آیا اور میری جرأت اور ہمت کی تعریف کی اس کے یہ الفاظ میں خود ستائش کے طور نہیں بلکہ تشکر اللہ کے طور درج کرتا ہوں جو اس نے کہے کہ ''بھگوان نے پاکستان میں آپ کو وہ مقام دیا ہے آپ جس کے حق دار ہیں۔'' یہ بھی اس کی بڑائی تھی، وگرنہ ایسے حالات میں اکثر لوگ دشمن بن جاتے ہیں، وگرنہ میں اپنے آپ کو حقیر اور عاجز سمجھتا ہوں۔

تیسرا واقعہ ٹنگڈار میں تعینات ایک ایس ڈی ایم کا ہے جو I.A.S آفیسر تھا۔ اس نے عدالت سے ملحق ایک فوجی ہیلی پیڈ پر ہیلی کاپٹر کے اترنے پر اس زمین کے مالک کی درخواست پر اس وقت تک پابندی لگا دی جب تک مالک مکان کو معاوضہ ادا نہیں ہوگا۔ جب اس کو معاوضہ ادا ہو گیا تو فوجیوں کے اسی ہیلی پیڈ سے ملحق راستہ پر آمد ورفت پر پابندی لگائی۔ ایس ڈی ایم نے مقامی بریگیڈیئر کو بذریعہ منسٹری ڈیفنس طلب کیا جس نے نوٹس موصول ہوتے ہی پابندی ہٹا دی۔

1970 سے 1976 تک ہمارے علاقے میں نذیر احمد کاؤسہ[74]، نذیر احمد ککرو، عبدالحمید میر، جھنکار سنگھ چمیہ، رتن لعل اور بھوش لال بطور منصف رہے جن میں سے رتن لعل ہائی کورٹ کے جج کے طور اور بقیہ سیشن ججز کے طور ریٹائر ہوئے۔ سب لوگ ایک سے بڑھ کر ایک لائق اور دیانتدار تھے۔ سوائے جھنکار سنگھ چمیہ کے باقی سارے لوگ حلیم بردبار، کم گو اور کم آمیز تھے اور ان میں سے کسی کے خلاف بددیانتی کا الزام نہیں لگا۔

غالباً میں سال 1973 یا 1974 میں جب میر محمد قاسم کشمیر کے وزیر اعلیٰ تھے اور ہمارے علاقے کے دورہ پر آئے تو علاقے کے بہت سے لوگوں نے میرے نانا جان کو مشورہ دیا کہ میر صاحب سے کہہ کر مجھے کہیں جج بھرتی کروا دیں کیوں کہ ان کے ساتھ میرے نانا کے مراسم تھے نانا جان نے جواب دیا، ''یہ اچھی بھلی نوکری چھوڑ کر آ گیا ہے اب کیا نوکری کرے گا۔ اگر اللہ نے چاہا تو یہ خود بڑے بڑے جج بھرتی کرے گا۔'' میرے خیال میں قبولیت کی ساعت تھی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ میں آزاد کشمیر، پاکستان آؤں گا، جہاں جج اور چیف جسٹس بنوں گا اور میری تجویز پر ہائی کورٹ کے جج اور میرے ہاتھوں کئی سول جج اور ڈسٹرکٹ جج بھرتی ہوں گے۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میرے چیف جسٹس ہائی کورٹ ہونے کے دوران حکومت وقت اور فوج کے کچھ جرنیلوں کو خواہش کے برعکس دو لائق جج ہائی کورٹس کی تقرری عمل میں آئی جن کا ذکر مناسب جگہ پر کیا جائے گا۔ اور ان کے ہاتھوں سے دیگر کئی لوگوں کی تقرری ہوئی جو میری کارروائی کا ہی تسلسل ہے۔

کشمیر میں میری سیاسی سرگرمیاں

مقبوضہ کشمیر میں میرے سکول کے زمانے میں سیاسی جماعتوں کی ہاہو نہیں تھی۔ کالج کے زمانے میں بھی سیاسی جماعتوں کا تو نہیں البتہ طلبا تنظیموں کا بہت زور ہوا کرتا تھا۔ لیکن اس زمانے میں یہ تنظیمیں فی زمانہ تنظیموں کی طرح سیاسی جماعتوں کی ذیلی شاخیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ تاہم قومی معاملات میں ان کا بہت دخل ہوا کرتا تھا۔ میرے سکول کے زمانے میں موئے مقدس کی تحریک چلی تھی

جس میں سب لوگ امت واحدہ کے طور شامل تھے۔ کالج کے زمانے میں جب شیخ محمد عبداللہ مرحوم کو 1964 میں جیل سے رِہا کیا گیا تو ان کے حق میں جلسے اور جلوس پاکستان کے حق میں مظاہرے ہمارا معمول تھا۔ اس سلسلے میں جب وہ بارہ مولہ آئے تو بارہ مولہ کالج میں مظفر حسین بیگ جو مقبوضہ کشمیر میں PDP سے وابستہ نائب وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں نے شیخ محمد عبداللہ کا بارہ مولہ میں استقبال کیا ہم لوگ ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے لیکن کسی شمار میں نہیں تھے۔ کلاس اور طلباء پالیٹکس اس معاملے میں زیادہ غالب رہتی تھی۔ اگر پاکستان دوستی اور محبت کا اظہار سیاست ہے تو اس میں ہم لوگ کسی سے پیچھے نہیں تھے لیکن اقتدار والی جماعتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں سال 1968 سے 1970 تک میری طلباء تنظیموں کی سیاست سے وابستگی رہی لیکن کسی سیاسی جماعت سے نہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طلباء یونین ہندوستانی یونیورسٹیوں میں سب سے زیادہ مضبوط اور فعال تنظیم ہوا کرتی تھی اور غالباً آج بھی ہے۔ اتر پردیش کی سیاسی جماعتوں کو اس کا اعتماد حاصل کرنے اور اس سے تعلقات رکھنے میں بڑی عزت محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے زمانے میں رام پور سے تعلق رکھنے والے ظہیر نامی ایک پٹھان یونیورسٹی یونین کے صدر ہوا کرتے تھے جن کا پورے شہر میں بڑا ٹھکا تھا۔ یہ خود ملائم سنگھ یادو کی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور انجینئرنگ فیکلٹی کے طالب علم تھے۔ وہ میرے روم میٹ بھی تھے، اس لیے میرے ان کے ساتھ گہرے تعلقات رہے جس کی وجہ سے یونیورسٹی میں میں بھی بہت جانا پہچانا جاتا تھا۔ لوگوں اور گروپس کے ساتھ بات چیت اور مذاکرات میں مجھے اکثر ساتھ رکھتے تھے جس کی وجہ سے مجھے زندگی میں پہلی بار Exposure (ایکسپوزر) ملا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس دوران بات کرنے کا سلیقہ، طریقہ، ڈھنگ، جرأت اور ہمت پیدا ہوئی۔

پاکستان، ہندوستانی مسلمانوں کی کمزوری بھی ہے اور کمزور ہونے کی وجہ بھی۔ جنگ آزادی کے دوران پاکستان کے حق میں تحریک سینٹرل انڈیا کے لوگوں نے چلائی جس میں اتر پردیش، دہلی، بہار اور راجھستان کے کچھ حصوں کے لوگ تھے۔ وہ زیادہ تر آباد اور خوشحال تھے

حالاں کہ ان کو علم تھا کہ ان علاقوں نے پاکستان میں شامل نہیں ہونا۔ اس وجہ سے ان علاقوں کے مسلمان آج بھی عتاب کا شکار ہیں اور اپنی قوت کے لیے پاکستان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ یہی ان کی کمزوری ہے۔ اس پس منظر کی وجہ سے ان کو دبایا بھی بہت جاتا ہے جو ان کے کمزور ہونے کی وجہ بھی ہے۔ کاش پاکستان اتنا مضبوط ہو جائے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی بقا کے لیے پاکستان کو ضمانت سمجھیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستانی مسلمانوں کی شناخت اور قومی ورثہ ہے اور اس میں آج تک اسلامی رنگ غالب ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ علی گڑھ ایک چھوٹا سا پاکستان ہے۔ اور پاکستان ایک بڑا سا علی گڑھ ہے۔ اس یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلباء ہندوستان میں کسی نہ کسی جگہ پر اپنا مقام بنا لیتے ہیں اور نمایاں بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ دراصل مسلمانوں کی تربیت گاہ ہے جہاں مجھے بھی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔

1970 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد میں وکالت کے عملی میدان میں آیا۔ اس وقت ہماری پوری ریاست میں سرکاری طور پر کانگریس اور فکری طور پر جماعت اسلامی اور کیمونزم ہی موضوع بحث ہوا کرتیں تھیں۔ میں اپنے خاندانی اور مذہبی پس منظر کی وجہ سے جماعت کے فلسفے سے بہت متاثر ہوا تھا۔ علامہ اقبال اور مولانا مودودی مرحوم کا لٹریچر میرا پڑھا ہوا تھا۔ احراروں اور سرسید کی تحریک کا لٹریچر مسلم یونیورسٹی میں پڑھا تھا۔ علی گڑھ میں مشاعرے ہوا کرتے تھے جس میں ہندوستان بھر اور پاکستان سے بھی شعراء جاتے تھے۔ میں ان میں باقاعدگی سے حصہ لیتا تھا، اس لیے ذہنی دریچے وا ہو گئے تھے۔ کشمیر میں جماعت کے لٹریچر سے متاثر ہونے کی وجہ جماعت کے سٹڈی سرکل کے ساتھ وابستہ اور اس کے ایک ہفت روزہ اخبار ترجمان الحق نکلا کرتا تھا' کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ اس زمانے میں دہلی سے جماعت کا ہفتہ وار انگریزی اخبار Radiance باقاعدگی سے جماعت کے ہر فرد کے پاس آتا تھا۔ جماعت ان دنوں سیاسی نہیں بلکہ تبلیغی جماعت کے طور کام کرتی تھی، تربیتی مشقیں ہوا کرتی تھیں جن میں کشمیر میں جماعت کے اکابرین علی گیلانی، سیف الدین مرحوم' سعدالدین مرحوم وغیرہ تقاریر کیا کرتے تھے۔ لوگوں کے فکری شعور کی بیداری کے لیے اس جماعت نے بہت کام

کیا۔سرکاری ملازمین اس میں زیادہ تر متحرک ہوا کرتے تھے اور اس پر کوئی پابندی بھی نہیں تھی۔ جماعت نے اپنے سکول اور درسگاہیں بھی 60 کے اواخر میں کھولنی شروع کردیں جن میں عام سکولوں کے مقابلے میں طلباء اور طالبات کی حاضری زیادہ ہوا کرتی تھی۔میں بھی اس سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔

جب جماعت نے 1972 کے پارلیمنٹ اور اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا میں نے جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک ہمدرد کی حیثیت سے اس کی بھرپور مخالفت کی۔میرا موقف یہ تھا کہ اس سے ہمارا تبلیغی اور تربیتی کردار ختم ہو کر سیاسی کردار ہو جائے گا جس کی وجہ سے ہمارے ساتھ وابستہ سرکاری ملازمین اور ہمارے سکولوں پر پابندی لگ جائے گی۔ہم لوگ آئینی حصار میں بند ہو جائیں گے اور برسراقتدار جماعتیں ہمارا جینا حرام کردیں گی جس وجہ سے تحریک اپنے مقصد سے ہٹ جائے گی۔میں نے ترجمان الحق، دعوت اور دیگر اخباروں میں مضامین بھی لکھے۔کانگریس والے اپنے مقاصد کے لیے میرے مضامین کی اشاعت کو ترجیح دلاتے تھے۔ان کے اپنے مقاصد تھے لیکن اس سے میرے مقاصد کی بھی تشہیر ہوا کرتی تھی۔1971 میں کچھ عرصہ کے لیے میں کشمیر سول سروس کے لیے منتخب ہونے کی وجہ سے سروس میں چلا گیا لیکن ایک سال سے کم مدت میں ہی استعفیٰ دے کر دوبارہ وکالت کے شعبہ سے وابستہ ہو گیا۔جماعت کے اکابرین کو میری مخالفت پسند نہ آئی انہوں نے اپنے تربیتی مراکز میں مجھے بلانا بند کردیا بلکہ میرے خلاف ایک مہم چلائی۔ان کا عام نعرہ ہوا کرتا تھا کہ ''جُدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''۔

میں نے بالآخر ایک مضمون لکھ کر جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی کہ اگر اقتدار اور الیکشن کی سیاست ہی کرنا ہے تو لوکل اور دینی جماعت کے پلیٹ فارم سے نہیں بلکہ قومی اور سیکولر پلیٹ فارم سے کرنا کشمیری مسلمانوں کے حق میں زیادہ بہتر ہے۔مقامی طور پر کانگریس پارٹی زیادہ موثر اور مستحکم تھی اور میرے خیالات کو چوں کہ وہ بہت پسند کرتے تھے اس لیے میں ان کے زیادہ قریب ہو گیا لیکن اس میں باضابطہ شمولیت اختیار نہیں کی۔1972 کے اسمبلی کے الیکشن میں میں نے بھی کرناہ کے حلقہ انتخاب

سے جماعتی ٹکٹ (جس کو ہندوستان میں مینڈیٹ کہا جاتا ہے) کے لیے درخواست دی۔میں نے یہ درخواست ریاستی کانگریس کے غلام رسول کار، مفتی محمد سعید جو ریاست کے وزیر اعلیٰ اور مرکزی وزیر داخلہ بھی رہ چکے ہیں، کے علاوہ عبدالغنی لون مرحوم کے کہنے پر دی جو اس وقت کانگریس کے کرتا دھرتا ہو اکرتے تھے۔میری درخواست وہاں کے لوکل اسمبلی کے ممبر خواجہ محمد یونس کے اعتراض پر کہ میں کانگریس کا ابتدائی اور سرگرم ممبر کے طور رجسٹرڈ نہیں ہوں مسترد کی گئی۔میرے سسر قاضی غلام حیدر صاحب نے بھی درخواست دی تھی لیکن ان کو بھی ٹکٹ نہیں ملا جو بالآخر خواجہ محمد یونس جو اس وقت ایم ایل اے بھی تھے، کو دیا گیا۔

میرے ساتھ اس وقت کرناہ کے نوجوانوں کی اکثریت تھی اور بہت با اثر لوگ بھی میری حمایت کرتے تھے جن میں عبدالرشید مرچال، عبدالرحمان بڈھانہ (بعد میں دو بار کشمیر قانون ساز کونسل کے ممبر بھی رہے) مدد خان، (بعد ازاں ایس ایس پی کے طور ریٹائر ہوئے) شامل تھے۔مقامی سکھوں کی ساری آبادی میری سپورٹر تھی۔ٹکٹ نہ ملنے کے بعد عبدالغنی لون جو ریاستی سطح پر ہماری سرپرستی کرتے تھے نے' مجھے عبدالرحمان بڈھانہ اور پیر یاسین شاہ کو حلقہ کرناہ سے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی ہدایت کی۔ہم نے ایسا ہی کیا۔کاغذات نامزدگی والے دن مجھے اور میرے تجویز و تائید کنندہ کو اغوا کرکے بند کیا گیا جس کی وجہ سے ریٹرننگ آفیسر کے پاس کوئی پیش نہیں ہو سکا اور کاغذات داخل دفتر ہو گئے۔لیکن عبدالرحمان بڈھانہ اور پیر یاسین شاہ کے کاغذات نامزدگی منظور ہو گئے۔کرناہ کا حلقہ انتخاب تین حصوں میں منقسم تھا جس میں دو حصے کرناہ اور کیرن کے تھے جن کے ووٹ کم لیکن فیصلہ کن حیثیت رکھتے تھے جبکہ تیسرا کپواڑہ تحصیل کے بڑے حصہ پر محیط تھا۔یاسین شاہ کپواڑہ والے کشمیری بولنے والے حصے سے تعلق رکھتے تھے' جبکہ عبدالرحمان بڈھانہ کا تعلق غیر کشمیری بولنے والے حصے سے تھا ذاتی طور پر گجر قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔کانگریس کے امیدوار خواجہ محمد یونس کا تعلق بھی یہیں سے تھا۔ چنانچہ الیکشن میں اس حصے کے ووٹ تقسیم ہو گئے اور دوسرے حصے کے ووٹ یاسین شاہ کے حق میں پول ہوئے جو آزاد امیدوار کے طور کامیاب ہو گئے۔اس طرح عبدالغنی لون بارہ مولہ ضلع کی اکثر سیٹیں لینے

میں کامیاب ہوکر قومی افق پر ایک باجرأت لیڈر کے طور سامنے آئے اور سیاسی توازن ان کے پاس چلا گیا۔حکومت میں ان کو وزارتِ صحت، تعلیم اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کے محکمے ملے۔

لون صاحب نے کرناہ کے حلقے سے مجھے پروجیکٹ کرنا شروع کردیا اور میں نے کیرن اور اس علاقے کے لیے میڈیکل اور انجینئرنگ کالجز میں خصوصی سیٹیں بھی مقرر کروائیں۔میری اس تجویز پر کہ جہاں پر دس بچے میسر ہوں ایک پرائمری سکول کا اجراء کیا جائے، عمل ہوا۔ میں نے ٹیچر بھی اپنی مرضی سے بھرتی کروائے۔اس کے علاوہ اس علاقے میں جتنے بھی ترقیاتی کام ہوتے تھے وہ میری مرضی کے مطابق ہونے لگے۔مجھے یاسین شاہ صاحب کا پورا اعتماد حاصل تھا۔جماعتی سطح پر میر محمد قاسم وزیر اعلی بنے جو شریف النفس انسان تھے۔لون صاحب کی وساطت سے میرے تعلقات ان سے بھی استوار ہوئے۔مفتی محمد سعید وزیر تعمیرات عامہ تھے ان کے ساتھ میرے تعلقات پہلے سے تھے اس وجہ سے میرا حکومت میں بہت اثر رسوخ تھا۔اس عرصہ کے دوران عبدالغنی لون کے حکومت کے ساتھ اختلاف شروع ہوگئے جو اس قدر شدت اختیار کرگئے کہ بالآخر لون صاحب کے استعفیٰ پر منتج ہوئے۔ اس سے قبل میں نے کرناہ میں کانگریس کی رکن سازی کی۔اس ضلع کا جنرل سیکریٹری نامزد ہوگیا جس وجہ سے مرکز تک بھی میرا اثر ورسوخ پیدا ہوا۔

1970 کے اواخر میں جب اندرا گاندھی نے اس علاقے کا دورہ کیا، میں نے اس کے خلاف مظاہرہ کرایا تھا۔ان دنوں وہاں پر فوج کے خلاف جنگل کی لکڑی کو ناجائز بالن اور تعمیر کے لیے استعمال کیے جانے کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔اس وجہ سے میری سیاسی اور سماجی پوزیشن واضح تھی لہٰذا میں مرکزی لیڈرشپ کی نظروں میں بھی نمایاں تھا۔ہندوستان میں جو بھی سکیم حکومتی سطح پر چلائی جاتی ہے اس کا دائرہ کار کشمیر اور کشمیر کے سرحدی علاقوں پر ضروری طور پر بڑھایا جاتا ہے۔اس لحاظ سے بھی مجھے خاص ٹاسک دیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں دریاؤں اور نالوں سے زمین کو کٹاؤ سے محفوظ کرنے کے لیے بنڈ،''اور گاؤں گاؤں جوڑو سکیم'' کے تحت پیدل چلنے کے راستوں کی تعمیر کی سکیموں میں بھی مجھے ایک کردار حاصل تھا۔اس وجہ سے میرا اثر رسوخ بہت گہرا ہوگیا۔ان سرگرمیوں نے میری جماعت میں

حیثیت کو مستحکم کیا اور بارہمولہ کے ہر حصے میں یکساں طور پر مقبولیت ہونے کے علاوہ نہ صرف ہائی کمانڈ تک رسائی ہوگئی بلکہ سماجی، سیاسی اور سرکاری حلقوں میں بھی میری شنید ہونے لگی۔

جب مجھے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے ملنے کے بہانے پاکستان آنے کا جنون بڑھتا گیا تو میں نے اس سلسلے میں سرگرمیاں شروع کیں۔اس زمانے میں انڈیا پاکستان کے سفارتی تعلقات سوئٹزرلینڈ کے سفارت خانے کے ذریعے ہوا کرتے تھے۔پاسپورٹ لینے میں کافی وقت لگا جس کے بعد ویزا لینا ایک کارے دارد والی بات تھی۔بہرحال چوں کہ میرے نانا صاحب بقید حیات تھے لیکن کافی بوڑھے اور علیل تھے، اس لیے میں نے اس سلسلے میں زیادہ مستعدی نہیں دکھائی۔ وگرنہ اپنے مقامی اثر رسوخ کی وجہ سے پاسپورٹ یقینا جلدی مل جاتا۔بہرحال جنوری 1976 میں میرا پاسپورٹ تیار ہوگیا جبکہ مارچ 1976 میں نانا صاحب کی وفات ہوگئی۔اب میرے لیے توجہ کا اور کوئی مرکز نہیں رہا۔گو کہ میرے ننھیال کے ہر فرد نے میرا اتنا ہی خیال رکھا، جتنا وہ اپنے بچوں کا رکھتے تھے۔مجھے ویزا بھی مئی یا جون 1976 میں مل گیا اور میں 18 اگست 1976 کو بذریعہ ٹرین امرتسر سے لاہور آیا۔گو کہ میری زندگی کی یہ تمنا تھی کہ میں 14 اگست کا دن پاکستان میں مناؤں لیکن ایسا نہ ہوا۔